یورپ میں فلسفۂ سائنس کا ارتقا

پروفیسر عبدالقدیر سلیم

دورِ جدید کے پرانے سائنس داں

کوپرنی کس کے اس دعوے نے کہ زمین سورج کے گرد حرکت کر رہی ہے' اور گیلی لیو کے اس انکشاف نے کہ چاند کی سطح پر بھی زمین کی طرح پہاڑ اور وادیاں ہیں' جدید سائنس کا آغاز کر دیا۔

بات اتنی سادہ نہیں تھی۔گیلی لیو کی کہانی پر تو ہم آیندہ صفحات میں بات کریں گے' ابھی یہ دیکھنے کی بات ہے کہ یورپ میں سائنس کے فروغ اور مذہب کے زوال کی داستان خطِ مستقیم میں چلنے والی ایک سیدھی اور سپاٹ کہانی نہیں ہے۔وہ لوگ بھی جو آج سائنس کے ہیرو اور شہید کے طور پر سامنے لائے جاتے ہیں' اور جنھیں مذہب دشمنی اور عقل دوستی (یورپ اور مشرق کے دانش وروں کے ایک گروہ نے انھیں لازم و ملزوم بنا دیا ہے) کی اسناد دی جاتی ہیں' بہت سے توہمات' غلط عقائد اور نیم پختہ نظریات کے پرجوش حامی اور پرچاری تھے۔برونو' (جسے کلیسائی عدالت نے مجرم قرار دینے کے باوجود سیکولر عدالت اور حکام کے حوالے کر دیا تھا) صرف زمین اور اجرام سماوی کی حرکت ہی کا قائل نہ تھا' بلکہ سیارگان کی اپنی انفرادی ''صفات'' اور ان کے اثرات پر بھی ایمان رکھتا تھا۔زہرہ کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے لوگ محبت' امن اور خیرسگالی طبیعت رکھتے ہیں' اور مریخ کے زیرِ اثر اشخاص جنگ جو' غصیلے' ہٹیلے اور منافرت کا مزاج رکھتے ہیں۔بہت سی بیماریاں بد اثرات اور بھوت پریت کے اثر سے پیدا ہوتی ہیں' اور کئی امراض شاہی لمس یا ساتویں بیٹے کے تھوک سے دُور کیے جاسکتے ہیں۔وہ اعداد اور کئی اشیاء کی طلسماتی خصوصیات کا بھی قائل تھا۔اس کے ساحرانہ علوم کی بھی تھوڑی بہت شہرت تھی (اور جادوگروں / جادوگرنیوں کو جلا دینا ہی اس زمانے میں سحر کا واحد توڑ تھا)۔آخر کار ۱۶۰۰ میں اسے زندہ جلا دیا گیا اور وہ ایک ''شہید سائنس'' بن گیا۔

صرف مذہبی لوگ ہی نہیں' بلکہ حکمراں' عوام اور دانش ور سبھی علم و جہل کی معجونِ مرکب کے رسیا تھے۔وِل ڈوران' ۱۵۶۳ کے ایک پمفلٹ کا اقتباس پیش کرتے ہیں: ابلیس کے ساتھ تعلقات

استوار کرنا' حلقوں اور کرسٹل کے ذریعے اس کی قربت حاصل کرنا' حاضرات کے عمل سے اسے دعوت دینا' اس کے ساتھ اتحاد قائم کرنا' اور اس طرح کے سینکڑوں ساحرانہ فنون اور عملیات کا آج کل ایسا رواج ہو گیا ہے کہ پہلے کبھی نہ تھا۔ اعلیٰ اور ادنیٰ' پڑھے لکھے اور جاہل 'سبھی اس میں یکساں طور پر ملوث ہیں (۱)۔ کیپلر 'جس نے جدید فلکیات کی بنیاد رکھی 'سیاروں کے بیضوی مدار اور ان کی رفتار' سورج سے ان کے فاصلے' ان کی گردش کے دورانیے وغیرہ سے متعلق "کیپلر کے قوانین" دیے' اس بات پر سنجیدگی سے یقین رکھتا تھا کہ سیاروں کی متحدہ حرکات سے ایک ایسی موسیقی جنم لیتی ہے' جسے صرف آفتاب کی "روح" ہی سن سکتی ہے۔ تاہم ریاضی اور حساب کتاب کی تفصیلات پر مبنی اپنی فلکیات کے ذریعے اس نے کوپرنی کس کے "آفتاب مرکز" نظریے کی راہ ہموار کر دی تھی۔

یہ وہ ذہنی اور علمی فضا تھی جب ۲۱ اگست ۱۶۰۹ میں گیلی لیو نے اپنی دوربین کا مظاہرہ کیا۔ وینس (اٹلی) کے بلند ترین چرچ سے اس نے شہر کے عمائدین اور اراکین سینیٹ کو اپنے "جاسوس شیشے" کے ذریعے سمندر کے ان جہازوں کا نظارہ کرا دیا' جو ابھی خالی آنکھ سے دیکھے جانے کے لیے دو گھنٹے کے فاصلے پر تھے۔ سب نے بڑی واہ واہ کی' اور اس کی بڑی ہمت افزائی کی گئی۔ وہ اپنی دوربین کو بہتر بناتا رہا۔ زیادہ بہتر اور طاقت ور شیشوں اور عدسوں سے اس نے اس دوربین کی قوت کو (خالی آنکھ کے مقابلے میں) ہزار گنا بڑھا لیا۔ اب اس نے اس کا رخ جو آسمانوں کی طرف پھیرا تو دنیا ہی بدلی ہوئی نظر آئی۔ کہکشاں میں' جو خالی آنکھ سے محض ایک روشن سحابی پٹی نظر آتی تھی' سیکڑوں ستارے نظر آنے لگے۔ اس دوربین کے ذریعے اسے سارا آسمان اور ستاروں کے جھرمٹ نئے نئے ستاروں سے معمور دکھائی دیے۔ چاند 'کسی دوسرے عالم کا اثیری کرہ نہ رہا' بلکہ پہاڑوں' وادیوں اور سطوح مرتفع کی ایک ایسی ہی "زمین" نظر آیا' جیسی ہماری اپنی زمین ہے۔

گیلی لیو کو اپنے انکشافات اور تحقیق کی پوری پوری داد ملی۔ اسے جامعہ پیسا کے "ریاضی دان اول" اور فلسفی کا خطاب دیا گیا' جب کہ اس پر لیکچر دینے کی کوئی پابندی بھی نہ تھی 'تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت مشاہدے اور تحقیق پر صرف کر سکے۔ مذہبی حلقوں میں بھی اس کی پذیرائی تھی' خود جناب پوپ نے بھی اسے خیر خواہی کا یقین دلایا تھا۔ تاہم اس کی کامیابیوں اور شہرت نے اسے خود سر اور مغرور بنا دیا تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں' حرکتِ ارض کے نظریہ کو پہلے ہی پیش کیا جا چکا تھا' لیکن اس نے اس نظریے کا ایک "حقیقت" کے طور پر ادّعا کرنا شروع کر دیا۔ کوپرنی کس کے نظامِ سماوی کی اس نے زور شور سے تبلیغ کی۔ اہلِ کلیسا کی رائے (اور ایمان) مختلف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے انجیل مقدس کی تردید ہوتی ہے 'جس کے مطابق ہماری زمین ہی اللہ تعالیٰ کے عرش کی حامل' اس کے چہیتے

فرزند کی قربان گاہ اور کائنات کا مرکز ہے۔

۱۶۱۵ء میں "عمائدین کلیسا کے دفتر مقدس" کی طرف سے اس سے کہا گیا کہ اگر وہ اپنی تصنیف میں چند جملوں کا اضافہ کر دے اور یہ لکھ دے کہ کوپرنی کس کا خیال ایک "نظریہ" ہے (نہ کہ ثابت شدہ حقیقت) تو اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ مگر اس نے اس سے انکار کیا۔ "جہاں تک اجرامِ کائنات کا تعلق ہے، میں عقیدہ رکھتا ہوں کہ سورج، اجسام سماوی کی دَوری گردش کے مرکز میں بے حرکت قائم ہے۔ جب کہ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے، اور سورج کے گرد گھومتی ہے"۔ آج ایک اسکول کا طالب علم بھی کہہ اٹھے گا کہ گیلی لیو کا یہ خیال کلیتاً نہیں، بلکہ صرف جزوی طور پر ہی درست ہے۔ زمین، سورج کے گرد گردش تو کرتی ہے، مگر خود سورج بھی ساکن نہیں، اور نہ وہ کائنات کا مرکز ہے، بلکہ وہ ستاروں کے اس مجموعے کا ایک اوسط درجے کا رکن ہے، جسے ہم اپنی کہکشاں کہتے ہیں، اور جس میں کئی ارب چھوٹے چھوٹے ستارے ہیں۔ اور یہ سب، اور خود کہکشاں بھی اپنے اپنے انداز میں متحرک ہیں (۲)۔ یہ تو نئی فلکیات ہے، مستقبل میں کون سے حقائق انکشافات کے منتظر ہیں، اور کون سے ترمیم اور تردید کی بھینٹ چڑھنے والے ہیں، اس کا علم اللہ ہی کو ہے۔

گیلی لیو اور حرکتِ ارض

تو ہوا یوں کہ گیلی لیو پر مقدمہ چلا اور اسے کرۂ زمین کی بجائے سورج کو مرکز کائنات کہنے کے جرم میں قید کی سزا دے دی گئی (۱۶۱۶)۔ اس بوڑھے کو، جو اپنی بینائی تقریباً کھو چکا تھا، شہید سائنس کا رتبہ حاصل ہو گیا، اور دنیا بھر کے آزاد خیال مصنفین اور کہانی لکھنے والوں نے اسے مذہبی جبریت کے خلاف خوب خوب استعمال کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے پنڈولم کی حرکت، لیور اور پُلی کے اصول، اجسام کی افقی حرکت و سکون وغیرہ کے کئی اصول دریافت کیے، جنھیں بعد میں نیوٹن نے قوانین کی حیثیت سے مدون کیا۔ آج یہ مباحث، ہمارے مدارس کے سائنسی نصاب کا حصہ ہیں۔ مگر اس کے بہت سے "انکشافات" اس سے بہت پہلے مشہور اطالوی مصور اور مجسمہ ساز لیونارڈو ڈاونشی (م ۱۵۱۹) کے ذہن رسا اور کارگر ہاتھوں کے آگے سپرانداز ہو چکے تھے۔ اس نے اپنی تصانیف میں کہیں بھی پیسا کے خمیدہ مینار والے تجربے کا ذکر نہیں کیا (کہتے ہیں کہ اس نے دو مختلف وزن کے آہنی گولے مینار سے گرا کر یہ ثابت کیا تھا کہ ایک ہی کثافت رکھنے والی دو اشیا زمین پر گرنے میں یکساں وقت لیں گی) جو بعد کے مصنفین نے اس سے منسوب کر دیا ہے، حالاں کہ وہ اپنے کارناموں کے اظہار میں کبھی بخیل نہیں پایا گیا۔ اس کی عام سماجی زندگی کا اس کی سائنسی فتوحات کے ساتھ عموماً ذکر نہیں کیا جاتا۔ ۱۶/ ۱۷ ویں صدی کے عیسائی اخلاق میں آزادیِ افکار (اور رسمی طور پر) آزادیِ اعمال کی گنجایش کچھ کم تھی۔ تاہم

اس نے ایک عیسائی نیکی 'یعنی تجرد کی زندگی کو اپنایا' کبھی شادی نہیں کی 'لیکن ایک داشتہ ضرور رکھی جس سے اس کے تین بچے ہوئے۔ لیکن مذہب اور اہل کلیسا پر خفیہ تبرا بھی اس کا شعار تھا (اس کے سائنسی "مکالمات" جن میں چرچ کے عقائد کا اِدّعا وہ ایک کم عقل اور بر خود غلط بے وقوف کے منہ سے کراتا ہے)۔ وہ خود ایک اڑیل اور متکبر انسان تھا۔ مگر ان تھک محنت 'عزم اور حوصلے نے اسے اس کی کاوشوں کا صلہ بھی بہت دیا۔ گویا وہ روشن خیالی کے دَور کے ایک ہیرو کی تمام خوبیاں اور کمزوریاں رکھتا تھا۔ اسے نئی ابھرتی ہوئی سائنس کا ایک پُراعتماد نمایندہ سمجھا جاسکتا ہے۔

سترہویں صدی کی سائنسی فکر اور فطریت کے نچوڑ کے طور پر کائنات اور انسان کی جو تصویر ابھر کر آتی ہے 'اس کی ایک نمایندہ مثال ہولباخ (D'Holbach: ۱۷۲۳-۸۹) ہے۔ فرانس کے ان نواب صاحب نے دوسرے آزاد خیال مفکرین کے ساتھ دائرۃ المعارف کی تالیف میں حصہ لیا' اور اپنے پیرس اور مضافاتی بنگلے میں ہفتہ وار نشستوں کے ذریعے دانش وروں اور "روشن خیالی کے چراغوں" کی ضیا سے اوہام و عقائد کی تاریکی دور کرنے 'اور سائنسی اور فلسفیانہ فکر کی روشنی پھیلانے میں نمایاں کردار ادا کیا' مذہب اور عقائد اور "کلیسائی جہالت" کے خلاف متعدد کتابیں تالیف کیں اور ۱۷۷۰ میں "نظامِ فطرت" (System of Nature) کے عنوان سے اپنا شاہکار دنیا کے سامنے پیش کیا' جس میں مادیت کے نظریے کو پورے زورِ استدلال اور قوتِ اظہار کے ساتھ واضح کیا گیا۔ بعد میں وہ اسی فلسفہ مادیت کے اخلاقی' سماجی اور سیاسی مضمرات کی توضیح کرتا رہا' اور اس طرح اس نے نئی زبان اور نئی اصطلاحات میں کائنات کے مادی نقطہ نظر کے مطابق وہ بنیادی ڈھانچہ کھڑا کر دیا' جس کے مختلف پہلوؤں کی ہربرٹ اسپنسر' ڈارون' کارل مارکس' فرائیڈ اور میکس ویبر نے جزئیات اور تفصیلات کے ذریعے نقش گری اور رنگ آمیزی کی' اور اسے ایک متحرک' جاندار اور غالب "فلسفہ کل" کا درجہ دلانے میں اپنی تمام ذہانت اور صلاحیتیں صرف کر دیں۔

ہولباخ اور مادیت

ہولباخ کی "نظامِ فطرت" کائنات اور انسان سے متعلق دو نقطہ ہائے نظر' دو نظریہ ہائے حیات کے تصادم کی داستان ہے۔ ایک طرف روشن خیالی' آزاد فکر' تسخیرِ کائنات کا عزم' انسان کا شرف اور بالادستی --- اور سائنس ہیں' اور دوسری طرف جہالت' ذہنی غلامی' احساس کم مایگی' اور ایک مقتدر مطلق ہستی (یا ہستیوں) کے آگے سپر اندازی --- یعنی مذہب۔ یہ ہے ہولباخ کی اسکیم۔ اور فطری طور پر وہ اس "حق و باطل" کی جنگ میں آپ سے مطالبہ کرتا ہے کہ اپنا سارا وزن اور حمایت خیر کی قوتوں کے حق میں استعمال کریں' تاکہ بدی کی قوتوں کا قلع قمع کیا جاسکے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ

آپ صحیح ' عاقلانہ اور مادی طرزِ فکر اپنائیں -غلط (اور ضرر رساں) فکر 'غلط اور بے بنیاد عقائد سے پیدا ہوتی اور انھی کی گود میں پروان چڑھتی ہے 'جو یہ ہیں: خدا پر ایمان 'روحانی قوتوں پر عقیدہ ' (جب کہ خدا اور روح محض الفاظ ہیں 'جن کی کوئی تعبیر نہیں) 'انسان میں کسی طرح کے الوہی عنصر 'یا ماورائے مادہ کسی روحانی جوہر کی جستجو 'یہ خیال کہ انسان اپنے ارادے اور اعمال میں خود مختار ہے (آزادی ارادہ پر ایمان) 'اور اس بات سے انکار کہ انسان بھی فطری قوتوں کا اسی طرح محکوم و اسیر ہے 'جس طرح نباتات وجمادات یا دوسرے حیوانات 'یا یہ کہ انسان ''اشرف المخلوقات'' یا اللہ کی بنائی ہوئی کوئی خاص تخلیق ہے ' یہ عقیدہ کہ مشاہدے 'تجربے اور عقل کے علاوہ بھی علم کے دوسرے ذرائع ہوسکتے ہیں (وحی 'الہام 'وجدان وغیرہ) 'سماج اور اخلاقیات کے شعبے میں مسرت 'لذت 'ضرورت و احتیاج کی تسکین وتکمیل اور افادے (utility) سے ماورا بھی کوئی اصول ہوسکتے ہیں ' دائمی اور ناقابل تغیر اقدار پر یقین -

ہولباخ دعویٰ کرتا ہے کہ انسان خوشی سے صرف اس لیے محروم ہے کہ وہ علمِ فطرت سے ناآشنا ہے -اس کی جہالت اور توہمات نے اسے اس طرح اسیر کر رکھا ہے کہ اپنی محرومیوں اور بدقسمتی کا حل طبیعیات کی بجائے مابعد الطبیعیات ' اور فطرت کی بجائے مافوق الفطرت میں تلاش کرنے میں لگ گیا ہے - حقائق کو گرفت میں لینے کی بجائے سراب اور چھلاووں کے پیچھے دوڑ رہا ہے -اپنی زندگی کو سنوارنے کی بجائے عاقبت کی خیالی زندگی بنانے کے سودائے خام کا شکار ہے -مگر یہ جہالت اور تاریکی خود بخود نہیں پیدا ہوگئے -یہ پیداوار ہیں فوق الفطرت مزعومات وعقائد کی 'اور ان کا مداوا صرف اس طرح ہوسکتا ہے کہ فلسفہ ' مابعد الطبیعیات اور مذہب کے خلاف ایک جہاد شروع کیا جائے 'تاکہ انسانی سائنسی فکر اور مادی تحقیق و جستجو کے ذریعے بدی اور استحصال کی قوتوں کو زیر کر سکے 'اور حصول مسرت میں کامیاب ہو-

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ فطرت ہے کیا؟ ''کائنات ' اپنے تمام موجودات کے ساتھ مادے اور حرکت (بعد کے فطریئین نے حرکت کی جگہ توانائی کا لفظ استعمال کیا 'اور پھر بعد والوں نے دونوں کو ایک ہی قرار دے دیا) کے علاوہ کوئی اور چیز ہمارے سامنے پیش نہیں کرتی -کائنات میں علت ومعلول کا ایک عظیم الشان اور لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہے 'اور اس کے علاوہ کچھ اور دکھائی نہیں دیتا-ان میں سے بعض علتوں کو تو ہم پہچان لیتے ہیں 'کیوں کہ وہ براہ راست ہمارے حواس پر اثرانداز ہوتی ہیں 'مگر جن کو ہم پہچان نہیں پاتے 'کہ ان کے اثرات راست نہیں 'بلکہ بالواسطہ ہوتے ہیں -گویا یہ ایک ''علت بعید'' ہوتی ہے -لیکن چوں کہ ہمیں ان مظاہر اور واقعات کا سبب معلوم نہیں ہوتا 'اس لیے ان

میں ہم کسی فوق الفطرت ہستی (خدا) کا دست کار فرما دیکھتے ہیں۔گویا فرق عادات 'معجزات وغیرہ جن کا مذہبوں میں چرچا ہے 'کوئی چیز نہیں 'کیوں کہ قوانین فطرت اٹل اور ناقابل تبدیلی ہیں۔ ہر واقعے اور حادثے کی قوانین فطرت کے مطابق سائنسی تفہیم ہو سکتی ہے 'بشرطے کہ ہمیں ان قوانین کا پورا پورا علم ہو۔"اتفاق" کوئی چیز نہیں کیوں کہ کائنات کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ اور بڑے سے بڑا ستارہ سب قوانین طبیعی کے تحت کام کر رہے ہیں۔گویا فطرت اپنے وسیع تر مفہوم میں ایک عظیم کُل ہے ' جو مختلف اقسام کے مواد' ان کے مختلف مرکبات' مختلف حرکات و اہتزازات سے ترکیب پاتی ہے۔اسی کو ہم کائنات کہتے ہیں۔کائنات (اپنی تمام حرکات اور تغیر کے باوصف) چوں کہ مادی الاصل ہے 'اس لیے اس کی تشکیل میں اور اس میں وقوع پذیر تغیرات میں 'کسی فوق الفطرت قوت کی کار فرمائی تلاش کرنا عبث اور خام خیالی کی بات ہے۔ہولباخ نے ایک دَور دائمی (eternal circle) کا نظریہ پیش کیا'جس کے مطابق "وجود" کا مجموعہ ہمیشہ یکساں رہتا ہے 'اگرچہ اس کے اجزا میں ہمیشہ تغیر واقع ہوتا رہتا ہے۔

مادیت اور انسان

ہولباخ کے خیال میں چوں کہ انسان بھی مادی الاصل ہے 'اور اسی فطرت کا ایک جزو ہے جس سے کائنات تشکیل پاتی ہے 'اس لیے اس پر کسی طرح بھی کوئی مخصوص اور نئے قوانین و احکام کا اطلاق نہیں ہوتا۔انسان بھی لازماً انھی قوانین میں جکڑا ہوا ہے' جو پوری (مادی) کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔اس طرح نہ صرف انسان کے لیے کسی خصوصی خلقی رتبے (درجہ روحانیت پر فائز ہونا'بقا) سے انکار کیا گیا'بلکہ اسے بھی محض ایک وہم قرار دیا گیا کہ انسان اپنے ارادے میں آزاد ہے۔انسان مختار نہیں 'بلکہ کائنات کی اور دوسری اشیا کی طرح مجبور محض ہے: حریت ارادہ محض ایک فریب نظر ہے۔

ڈیکارٹ نے انسان کی فطرت میں ثنویت کا اقرار کیا تھا'یعنی یہ کہ وہ مادے اور روح کا مرکب ہے 'ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہولباخ اس سے انکار کرتا ہے۔انسان چونکہ کلیتاً مادی الاصل ہے 'اس لیے اس کی فکر 'ارادہ' احساس کی کیفیات 'اس کی محبت و نفرت 'پسند و ناپسند 'اس کے عزائم اور خوف 'گویا اس کی کُل زندگی مادی مظاہر ہی سے صورت گر ہوتی ہے۔اسے اپنے بے ثبات وجود کو تسلیم کر لینا چاہیے: وہ فطرت کی مادی قوتوں اور طبعی قوانین کی کار فرمائی سے ظہور پذیر ہوا ہے 'اور انھی کے زیر اثر وہ فنا ہو جائے گا۔کائنات میں انسان کا کوئی خاص مقام نہیں 'نہ وہ خلیفتہ اللہ ہے 'اور نہ فطرت کا کوئی نایاب گوہرِ شب تاب 'بلکہ دوسرے حیوانات کی طرح محض ایک حیوان ہی ہے 'بس اپنی عقل اور جسمانی ساخت (جو خود بھی طبعی قوانین کی پیداوار ہیں) کی بنا پر دوسرے حیوانات سے زیادہ ترقی یافتہ بن گیا ہے۔عقل و فہم بھی دماغ ہی کے افعال و وظائف ہیں' ان سے ماورا کوئی چیز نہیں۔اور

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں 'کمیت رکھنے' جگہ گھیرنے والا ایک مادی جسم ہے۔اس طرح عقل' احساسات اور جذبات بھی مادی الاصل ہیں۔ انسان کا مزاج 'کردار اور افعال بھی اس کی طبعی ساخت ہی کے مظاہر ہیں۔اس کی وراثت اور ماحول و تربیت اسے وہ کچھ بنا دیتے ہیں' جو کہ وہ بن جاتا ہے۔دوسرے الفاظ میں یہاں بھی کسی بخت و اتفاق کی گنجائش نہیں۔ ہر انسان (اور معاشرہ) اپنے ارث اور ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔

جہاں تک انسانی اخلاق کا تعلق ہے' مذہب اور روحانیت انسان کی تعمیر اور تشکیل اخلاق کے لیے جو منصوبہ بندی کرتے ہیں' ان کے نتائج غیر حتمی ہی ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم سائنسی (یعنی مادی' میکانی) بنیادوں پر انسانی کردار کی تشکیل و تعمیر کریں تو نتائج یقینی ہوں گے۔کیوں کہ ایک عضویے (organism) کی حیثیت سے انسان بھی ایک مشین ہی ہے' اگرچہ زیادہ پیچیدہ اور عسیر الفہم۔تاہم سائنس کی بڑھتی ہوئی فتوحات کی روشنی میں یہ ناممکن نہیں کہ ایک دن ہم انسان' اس کے ذہن (یعنی دماغ کی فعلیت) کو پوری طرح سمجھ لیں گے' اور ہمیں پتہ چل جائے گا کہ اس میں طبعی اور کیمیاوی تبدیلیوں کے ذریعے اس کے کردار کی تشکیل نو کیوں کر کی جاسکتی ہے۔بہرحال' اخلاقی طور پر نیک اعمال وہ ہیں' جو ہماری بقا اور مسرت کا باعث ہوں۔جس کام سے فائدہ ہوتا ہو' وہ اچھا کام ہے (معیار اخلاق: افادیت)۔نیکی یا اخلاقی خوبی (virtue) وہ ہے' جس سے معاشرے میں رہنے والے انسانوں کو مستقل فائدہ پہنچے۔ہم سب مسرت و لذت ہی کے رسیا ہیں' اور ان سے بالا کوئی شئے نہیں' جسے ہم معروض طلب کہہ سکیں' یا جس کی خواہش کی جائے۔انھی مقاصد کے حصول کی ذہنی استعداد کو ہم عقل کہتے ہیں۔عقل اگر ہمیں بعض فوری خواہشوں کی تکمیل سے روکتی ہے' تو اس کی بات محض اس لیے قابل قبول ہے کہ اسے مان لینے سے مستقبل کی عظیم تر مسرتوں اور لذتوں کا راستہ کھلتا ہے' ورنہ عقل فی نفسہٖ کوئی قابلِ قدر شئے نہیں۔ آگے چل کر یہی نقطۂ نظر عقل کی ''آلاتیت'' (instrumentalism) کا باقاعدہ نظریہ بن گیا۔

ہم نے ہولباخ کے مادی' سائنسی نظریے کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ آیندہ ڈھائی سو سال کا غالب سائنسی' تہذیبی اور سماجی موسم اسی کے رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے۔انیسویں صدی کے اواخر اور پوری بیسویں صدی کی تہذیب و ثقافت' جنگ و صلح' سیاست و حکومت' پیداوار و صرف' تقسیم دولت اور معیشت' فن و ادب' کھیل اور مشاغل فرصت' لذت کوشی اور فوری مسرت کی طلب' سب کے سب منطقی طور پر اسی فکر کے مظاہر ہیں' جنھیں بعد میں ڈارون (۱۸۰۹-۸۲) نے حیاتیات کے میدان میں (حیوانات میں انواع کا ارتقا' جہد للبقا اور بقائے اصلح کے اصول کے تحت)'

ہربرٹ اسپنسر (۱۹۰۳-۱۸۲۰ء) نے نفسیات ' عمرانیات ' اخلاقیات ' سماجیات اور تعلیم کے میدان میں ' کارل مارکس (۸۳-۱۸۱۸) نے سیاسیات و معاشیات کے میدان میں (مادی جدلیت ' معاشرے کے ارتقا کی معیشتی بنیادیں)' اور جان ڈیوی (۱۹۵۲-۱۸۵۹) نے تعلیم و سماجیات کے میدان میں (سائنس اور سماجی اقدار کا تعلق : آلاتیت) وسعت دی۔

سائنس اور انسان

یورپ میں کلیسا اور "روشن خیالی" "آزاد رو" فلسفیوں اور سائنس دانوں کے عہد میں ایسے اور بہت سے نام آتے ہیں' جن کا مطالعہ دلچسپ ہو گا۔ ان میں نیوٹن ' فرانسس بیکن ' ہابس ' پاسکل ' والیٹر' ہیوم اور بہت سے لوگ شامل ہیں۔ آزاد خیالی اور ترقی پسندی کے اس عہد میں مذہب کی مخالفت ' مافوق الفطرت کا انکار "روحانی تجربات" کی تردید سکہ ہائے رائج الوقت بن گئے۔ عمومی طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ مادہ اور حرکت (بعد میں توانائی) اور ان کے مظاہر ہی تمام موجودات و حقائق کی بنیاد ہیں۔ لا موجود الا اللہ سے لا موجود الا المادہ کی طرف سفر ایک نازک نکتہ تھا' جسے عبور کر لیا گیا۔ یہ مان لیا گیا کہ فطرت اور خود وجودِ انسانی کے تمام مظاہر' آثار اور تبدیلیوں کی فطری اور طبعی انداز سے تفہیم کی جا سکتی ہے' تو دُور از کار "بعید از قیاس" عناصر کو داخل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ واقعات و حوادث اور موجودات کی تفہیم میں ولیم آکم کا اصول ہی برتا جائے (یعنی ضرورت سے زیادہ عوامل کو بیچ میں لانے کی کیا ضرورت ہے' جب کوئی مسئلہ عقدہ بغیر ان کے بھی حل کیا جا سکتا ہو؟)۔ تجربیت (جو چیز محسوسات و تجربات کی زد میں آئے وہی حقیقی ہے)' جبریت (انسان ' کائنات اور کل فطرت 'متعین طبعی قوانین کے ہاتھوں مجبور محض ہے' اور ان سے سرتابی کی مجال کسی کو نہیں)' عقل پر کلی اعتماد اور انحصار کہ یہی آخر کار ہر تنازعے میں قاضی مطلق ہے' اور امامت و ہدایت کی سزاوار بھی ' روایت ' وجدان اور الہام کی تردید' نفس انسانی کی حرکیات کی تفہیم میں لذت و مسرت کا فائق قانون ' اخلاقیات کی قلم رو میں حصول لذت و افادے کا اصول (وہی کام اچھا ہے' جس میں مسرت ' لذت یا فائدہ ہو)' اور ان سب کے نتیجے میں خدا کو کائنات (یا ہماری دنیا) کے عرش سے اتار کر اس پر انسان کو فائز کر دینا ۔۔ "جمہوریت" یا سلطانی جمہور ۔۔۔ یہ سب وہ نشانات منزل ہیں' جن کی مدد سے ہم "عہد جدید" میں پہنچے ہیں۔

سائنس اور آزاد خیالی کے اس دور میں مغرب کے سیکولر (لامذہب) دانش وروں کی تگ و دو اور کاوشیں جتنی اخلاص کے ساتھ حقیقت تک پہنچنے کے لیے تھیں ' اتنی مذہب کو غیر معتبر اور خرد دشمن ثابت کرنے کے لیے بھی تھیں۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ مذہب تلاشِ حق و حقیقت میں مزاحم ہو۔

ہے ' اس لیے کہ وہ جھوٹا ہے ' دروغ بافی اور جہالت کو فروغ دیتا ہے ' اور انسان کی ترقی اور فلاح کے لیے نقصان دہ ہے ۔ یہ نقطہ نظر اہل دانش کی کاوشوں (سنجیدہ علمی ' فلسفیانہ ' سائنسی تحریروں ' افسانوں ' ناولوں ' ڈراموں اور شاعری) سے اس طرح پروان چڑھا کہ عمومی طور پر مغربی ذہن اور سائیکی کا حصہ بن گیا ' اور اٹھارویں صدی کے بعد شروع ہونے والی مغرب کی نو آبادیاتی فتوحات کے بعد اس کے زیر تسلط تقریباً سارے عالم پر محیط ہو گیا ۔

سائنس اور آزاد خیالی کی اس یلغار کے نتیجے میں جو مذہب باقی بچا ' اس نے اپنے دعووں اور اپنے عمل دخل کو بڑی حد تک محدود ' مذہبی رسوم ' عبادات اور ان عقائد تک محدود کر لیا جو سائنس ' مشاہدے اور تجربے سے براہ راست متصادم نہیں تھے ۔ اہل کلیسا میں سے بہت سوں نے بعد میں اعتراف کر لیا کہ مذہب اور مذہبی مزعومات پر اہل سائنس و دانش کے حملے اپنا جواز رکھتے تھے ۔ اس سب کے نتیجے میں یورپی معاشرہ بلکہ عالمی کلچر گزشتہ دو سو سال میں الحاد اور لامذہبیت کے ایک ایسے عمل سے گزر رہا ہے ' جس نے مذہب کو میدان سے بالکل ہٹا دیا ہے ' یا اسے معطل کر کے عملاً غیر موثر اور خارج از بحث بنا دیا ہے ۔

حواشی

۱- Bryan Appleyard. Understanding the Present.

۲- دیکھیے ' پال ڈے ویس God and the New Physics ' ۱۹۸۳ ' ص ۱۱